پہلی قسط

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

مولانا فخر الاسلام علیگ ❖

تعارف

۱۹ویں صدی عیسوی کے ثلثِ آخر میں جس وقت ہندوستان میں نئے افکار ورجحانات کے آنے سے ایک ہلچل پیدا ہوئی، اُسی وقت سے جدید علم کلام کی وضع و تدوین کے مطالبے کی صدا بھی گونجنا شروع ہوئی۔ علم کلام جدید کے نام سے درحقیقت قدیم اصولوں پر ایک خاص قسم کا اعتراض وتنقید تھی۔ اور وہ یہ کہ:

''نئے علوم وفنون بالخصوص فلسفۂ جدیدہ (وسائنس) کی تعلیم سے طلبہ کے عقائد میں خلل وفساد واقع ہوتا ہے، وہ اُس کلام (علمِ کلام۔ف) سے دور نہیں ہوسکتا، جسے عباسی دور کے متکلمین نے یونانی فلسفہ کے نقصانات کے لیے ایجاد کیا تھا، اور نہ ہی قدیم علم کلام کی تعلیم سے اُن اعتراضات کے دفاع کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے، جو جدید فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں اسلامی عقائد وتعلیمات پر عائد کیے جاتے ہیں''۔ (۱)

اِسی بات کو دیگر الفاظ میں یوں کہا گیا کہ: ''جو طریقہ دین کی حمایت کا بہ مقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا، وہ اِس زمانے میں کچھ بکار آمد نہیں رہا۔ یہاں تک کہ جو مصنفین اِس زمانے میں اُس طریقے پر کاربند ہوتے ہیں، اُن کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُن کے دل میں خطور کرتے ہیں، وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔'' (۲)

پھر مذکورۃ الصدر اعتراض کے سائے میں مطالبے کو بہ طرزِ سوال اِس طرح پیش کیا گیا کہ: ۱- مذہب پر

❖ ایم اے مظاہری علیگ

(۱) پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، (الہند: ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، د.ط، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۵۹، ۵-۷۔

(۲) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص: ۲۱۶-۲۱۷۔

عموماً اور مذہبِ اسلام پر خصوصاً جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں، اُن کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟
۲- علماء جب تک اُن خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیوں کر دے سکیں گے؟ ۳- کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور اُن کے اعتراضات کے جوابات نہیں دیے تھے، اگر اُس وقت اُس زمانے کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا، تو اب (سائنس کا سیکھنا) جائز کیوں نہیں؟ پھر یہ نتیجہ بھی نکالا گیا کہ: ''جمود پسند طبیعت، ماضی کے پرستار ذہن اور تن آسانی کی عادت نے اِن سوالات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔'' (۱)

خلاصہ یہ کہ جدید تعلیم یافتوں کی احکام اسلام کی طرف سے بے چینی، قدیم فلسفہ اور قدیم علم کلام کا نقص اور علما کی جدید علوم کی تحصیل کے تئیں غفلت کو دیکھتے ہوئے مفکرینِ عصر کی جانب سے جو کچھ ضرورتیں اور تجویزیں پیش کی گئیں وہ (بہ طورِ مثال) یہ ہیں: ''موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اولین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں، تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اُس کو پڑھے، اور اُس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے''۔ (۲)

''ضروری ہے کہ ہمارے علماء سائنسی نقطۂ نظر سے اِن مادہ پرستانہ دعووں کی نامعقولیت پوری طرح ثابت کر دیں۔ یہ عصر جدید کا ایک تجدیدی کارنامہ ہوگا، اور دین و مذہب کی بہت بڑی خدمت بھی۔ اِسی کا نام علم کلام ہے اور یہ موجودہ دور کی ایک اہم ترین علمی ضرورت ہے۔'' یعنی ''موجودہ علم کلام وہ ہے، جو جدید علوم ونظریات اور خاص کر مادی افکار و فلسفوں کے مقابلہ کے لیے مطلوب ہے''۔ جدید علم کلام کا دائرہ اب صرف عقائد تک محدود نہیں رہا، بل کہ وہ عبادت و اخلاق اور تمام معاملاتِ زندگی تک وسیع ہوگیا ہے۔ ذہنی وفکری اعتبار سے کوئی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری ہے، کہ اسلامی نظام حیات کو ایک نئے فلسفے یا نئے کلام کے روپ میں پیش کیا جائے۔ موجودہ دور عقلیت پسندی (rationalism) کا دور ہے، اور آج لوگوں کو وہی چیزیں مطمئن کر سکتی ہیں، جو عقلی واستدلالی اعتبار سے مُسکِت اور تسلی بخش ہوں۔'' (۳)

''ابتدائی صدیوں میں جب اسلام کے عقائد پر فقہائے اسلام اور متکلمین کام کر رہے تھے، تو اسلام کے عقائد پر جو اعتراضات اور حملے یونانیوں کی طرف سے ہو رہے تھے۔ اُن اعتراضات کا جواب علماء اور متکلمین نے احادیث کی روشنی میں دیا۔ آج اسلام اور اسلام کے عقائد پر وہ اعتراضات نہیں ہو رہے ہیں۔ قدیم یونانی فلسفہ ختم ہوگیا۔ آج نئے انداز سے حملے ہو رہے ہیں، آج اسلامی عقائد اور تعلیمات پر مغربی

---

(۱) پروفیسر سعود عالم قاسمی ''سرسید اور جدید علم کلام'' ترجمان دارالعلوم، اپریل- جون ۲۰۱۶ ص ۱۸۔
(۲) فکر کی غلطی، ص: ۲۷۵؛ بحوالہ الرسالہ، جولائی ۱۹۸۹ء ص: ۱۵-۱۶۔
(۳) شہاب الدین احمد ندوی، تخلیقِ آدم اور نظریۂ اِرتقا: ص ۲۲، ۲۳

نظریۂ علم کے حوالہ سے اسلام پر اور ہی انداز کے اعتراضات ہو رہے ہیں، آج مغربی نفسیات نبوت پر اعتراض کر رہی ہے۔آج کی سائیکالوجی نبوت کو بطور ماخذ علم نہیں مانتی، وحی کو بطور مصدر، علم نہیں مانتی''۔ ''وحی''بطور ذریعۂ علم کے قابلِ قبول ہے کہ نہیں، ابھی اِس کے ماننے میں بھی آج کے انسان کو تردد ہے''۔(۱)

''میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور (انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے محیط عرصے) میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا، جو جدید سائنٹیفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔''

کیا عہدِ جدید کے لیے علما کے دفاعی اصول ناکافی ہیں؟

یہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں علم کلام جدید کے مطالبہ کے لیے بلند ہونے والی صدائیں تھیں۔اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِس پورے عرصہ میں علمائے امت نے دفاعِ اسلام کا فریضہ انجام دینے میں پہلوتہی کی۔اِس کا مغالطہ آمیز جواب ایک مفکر نے-یک وصد سالہ فکری جائزہ پیش کرتے ہوے-اِس طرح دیا:''امتِ مسلمہ کو غیر مسلم اقوام کے علمی، دینی اور تہذیبی حملوں کا سامنا تھا، علمائے امت اپنے طریقے سے اُن کا مقابلہ کر رہے تھے؛ مگر اُن کا دفاع ناکافی بھی تھا، ناقص بھی اور معذور بھی۔''(۲)

دفاعِ اسلام کا کام کس نے کیا؟

پھر دفاع کا کام کس نے کیا؟ اِس سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ علمائے اسلام کا دفاع ناکافی، ناقص اور معذور دیکھ کر سرسید احمد خاں نے دفاعِ اسلام کے لیے علم کلام جدید کی تدوین کا بیڑا اُٹھایا۔تو کیا وہ دفاع میں کامیاب ہوئے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ اُنہوں نے مزید کچھ اُلجھنیں پیدا کردی ہوں؟ اِن سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمارے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوگیا ہے کہ اُن کے دفاع کی نوعیت کیا تھی؟ اُنہوں نے دفاع کا اصول اور طریقۂ کار کیا مقرر کیے؟ تفصیل کا تو موقع نہیں، نہایت اِجمال کے ساتھ اُن کے دفاعی نوعیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔سرسید احمد خاں نے اپنی ریفارمیشن اِسکیم میں قوانین فطرت کو اصل الاصول قرار دے کر اُن کے تحت چند امور کو بطور خاص اہمیت دی ہے:

منشوراتِ سرسید

۱: اصول وفروع میں سلف کی اتباع کے مقابلہ میں آزادیٔ رائے کی اہمیت مسلم امت کے ذہن میں

---

(۱) محمود احمد غازی، محاضرات حدیث، ص: ۴۵۷-۴۵۹۔

(۲) پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، (الہند: ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، د.ط، ۲۰۰۱ء) ص: ۱۵۹۔

بٹھانا۔۲: مذہبی عقائد، خیالات اور افعال کی اصلاح اہلِ مغرب کے وضع کردہ قوانین فطرت کے اصولوں سے۔۳: سائنسی اور ''فطری'' اصولوں کے برخلاف پائے جانے والے مذہبی مسائل کی از سرِ نو تحقیق و تدقیق۔۴: متقدمینِ اہلِ اسلام کی جانب سے مذہبی مسائل میں کی گئی غلطیوں کی نشاندہی اور سائنسی و فطری اصولوں پر اُن کی تصحیح۔(۱) اِس طریقۂ کار کے غلط ہونے میں کوئی شبہہ نہ تھا جس کی طرف توجہ دلانے کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سر سید احمد خاں کو مکتوب بھی لکھا تھا (جو اگرچہ بھیجا نہ جا سکا؛ لیکن بعد میں حضرت تھانویؒ نے اُسے خود شائع کیا) وہ مکتوب اُن لوگوں کے لیے- آج بھی ایک کھلی فہمائش ہے- جو یہ کہتے ہیں کہ: ''سر سید نے جدید علم کلام کے جو اصول تحریر کیے اُن پر اعتراض کی گنجائش بہت کم تھی۔'' مکتوبِ اشرف کے بعض اِقتباسات یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

''مکرما! جہاں تک آپ کے مساعی اور تصانیف کو غور کر کے دیکھا (تو) یوں معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں۔- الف:: خیر خواہی اسلام۔ب: خیر خواہیٔ مسلمانان۔ خیر خواہیٔ اسلام نے اِس پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہبِ اسلام پر مخالفین کے ہیں، اُن کے جواب دیے جاویں۔ اور خیر خواہیٔ مسلمانان اِس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو حضیضِ تنزل میں گرے ہیں اُن کو ترقی پر پہنچایا جاوے۔ اِن دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی منصف کو کلام نہیں ہوسکتا؛ مگر صرف غور طلب یہ امر ہے کہ اِس کے ذرایع کیا چیز ہیں۔ اِس کی تعیین باعثِ اِختلافِ خیالاتِ سامی اور جمہورِ اہلِ اسلام ہے۔'' (آگے لکھتے ہیں:) آپ نے اسلام کے اوپر سے اعتراض رفع کرنے کی صورت یہ ٹھہرائی کہ: ''جو تحقیقات جدیدہ ہیں، اُن میں کلام نہ کیا جائے؛ بلکہ جس طرح بن پڑے اسلام کو اُس پر منطبق کر دیا جاوے۔ اور منشا اِس تجویز کا صرف یہ دلیل ہے کہ تحقیقاتِ جدیدہ مطابق واقع کے ہیں اور اسلام غیر مطابق واقع کے نہیں۔ دوسرے مقدمہ کے تسلیم میں تو کسی مسلمان کو گنجائشِ (انکار) نہیں۔ رہا پہلا مقدمہ؛ (کہ تحقیقاتِ جدیدہ مطابق واقع کے ہیں) وہ محلِ کلام ہے۔ اِس کی کیا دلیل ہے کہ سب تحقیقاتِ جدیدہ صحیح ہیں؟''

طریقۂ کار کا تجزیہ از حکیم الامت

پھر تمثیلاً اہلِ سائنس کی بعض تحقیقات ذکر کر کے حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ چند سوالات کرتے ہیں

۱- ''اِن تحقیقات کے بالمقابل نصوص کی تصریحات قبول کرنے میں: ''کون سی دلیلِ عقلی قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے۔'' (۲)

(۱) ڈاکٹر سید عابد حسین: علی گڑھ میگزین ۱۹۵۴-تا-۱۹۵۵ء ''سید کا خواب اور اُس کی تعبیر'' ص ۶،۷۔
(۲) حکیم الامت: اصلاح الخیال: ص ۳۶۔

۲-’’(اگر اہلِ سائنس کو بعض چیزوں کا علم نہیں ہوسکا، یا تلاشِ بسیار کے بعد بھی ایسی چیزوں کا وجود جن کی نصوص نے خبر دی ہے، محسوس نہیں ہوا، یا دریافت نہیں ہوا، تو یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ:) کسی چیز کا محسوس نہ ہونا‘‘ نہ ملنا، نظر نہ آنا دلیل اُس کے عدم کی نہیں ہوتی۔‘‘ ایسی حالت میں ’’نصوص کی کیوں تاویل کی جاوے؟‘‘

۳:’’فلاسفۂ جدید نے معجزاتِ انبیاء کا انکار کیا، اِس وجہ سے کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ اِس پر کون سی شافی دلیل موجود ہے جس سے نصوص کو مصروف عن الظاہر (کرکے نصوص میں تاویل) کیا جاوے؟ رہا یہ کہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ اِس فطرت کی ماہیت آج تک متعین نہیں ہوئی جس سے کوئی قاعدہ منضبط ہوسکے۔‘‘

اب ہم متذکرہ بالا مطالبۂ علم کلام جدید کا تجزیہ پیش کریں گے:

اصل واقعہ یہ ہے کہ مطالبہ کرنے والے ’’مخلصوں‘‘ کو ’’جدید‘‘ کی نوعیت اور مصداق سے واقفیت تھی اور نہ یہ پتہ تھا کہ علم کلام کے تناظر میں ’’جدید‘‘ کا مطلب کیا ہے؟ اُنھیں اِس کے نام سے کیا مغالطہ دیا جارہا ہے؟ غور سے دیکھیے، تو علم کلام جدید کی تدوین کا مطالبہ درحقیقت فکری التباسات اور مغالطات کا آمیزہ تھا، جس کی وجہ سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ’’تدوینِ علم کلام جدید‘‘ کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے تو ’’جدید‘‘ ہی کی تحقیق فرمائی۔ پھر اِسی ضمن میں بعض امور کی اصلاح بھی فرمائی:

ا: پہلی اصلاح: صحیح اصولوں پر بے اعتباری کے رجحان کے متعلق: ’’اِس زمانے میں جو بعض مسلمانوں میں اندرونی دینی خرابیاں عقائد کی اور پھر اُس سے اعمال کی پیدا ہوگئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، اُن کو دیکھ کر اِس کی ضرورت اکثر زبانوں پر آرہی ہے، کہ علمِ کلام جدید مدوّن ہونا چاہیے‘‘۔ (لیکن مدون شدہ علمِ کلام کے اصول پر نظر کرنے کے سے یہ مطالبہ) ’’خود متکلم فیہ ہے؛ کیوں کہ وہ اصول بالکل کافی وافی ہیں؛ چناں چہ اُن کو کام میں لانے کے وقت اہلِ علم کو اِس کا اندازہ اور تجربہ عین الیقین کے درجہ میں ہوجاتا ہے‘‘۔ ’’کہ گو شبہات کیسے ہی اور کسی زمانہ میں ہوں؛ مگر اُن کے جواب کے لیے بھی وہی علمِ کلام قدیم کافی ہوجاتا ہے‘‘۔

۲: دوسری اصلاح: اجزائے دین میں تصرف سے متعلق: یہ قدیم اصولوں کے بے اعتباری کے رُجحان کی اصلاح تھی۔ پھر چوں کہ تدوینِ علم کلام جدید کے مطالبہ کرنے والوں کی غرض شرعیات میں تبدیلی تھی، لہذا اس کی اصلاح بھی ضروری خیال فرمائی گئی کہ قدیم علم کلام کے اصول کافی ہونے کے باوجود علم کلام جدید کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے، تو: ’’مقصود اکثر قائلین کا اِس مطالبہ سے یہ ہوتا ہے، کہ شرعیاتِ علمیہ وعملیہ، جو جمہور کے متفق علیہ ہیں اور ظواہر نصوص کے مدلول اور سلف سے محفوظ ومنقول ہیں، تحقیقاتِ جدیدہ سے اُن میں ایسے ا: تصرفات کیے جائیں، کہ وہ ۲: (شرعیاتِ علمیہ وعملیہ) اُن تحقیقات پر منطبق ہوجاویں۔ ۳: گو ان تحقیقات کی صحت پر مشاہدہ یا دلیلِ عقلی قطعی شہادت نہ دے۔ سو یہ مقصود ظاہر البطلان ہے۔‘‘ یعنی

مقصود باطل ہے اور اُس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۳: تیسری اِصلاح: جدید تحقیقات کی قطعیت سے متعلق: اور چوں کہ شریعت میں تصرف کا رُجحان اِس وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ جدید تحقیقات سے متعلق یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ یہ قطعی ہیں، لہذا تیسری اصلاح اِسی خیال کے متعلق یہ فرمائی گئی کہ ا: ''جن دعووں کا نام تحقیقاتِ جدیدہ رکھا گیا ہے، ا: نہ وہ سب تحقیق کے مرتبہ کو پہنچے ہوئے ہیں؛ بلکہ زیادہ حصہ اُن کا تخمینیات و وہمیات ہیں۔ اور ۲: نہ اُن میں اکثر جدید ہیں؛ بلکہ فلاسفۂ متقدمین کے کلام میں وہ مذکور پائے جاتے ہیں، اور ۳: ہمارے متکلمین نے اُن پر کلام بھی کیا ہے۔ چناں چہ کتبِ کلامیہ کے دیکھنے سے اِس کی تصدیق ہوسکتی ہے''۔ معلوم ہوا کہ نئی تحقیقات کے دو حصے اپنی اصل کے اعتبار سے قدیم ہیں۔ رہا ایک حصہ جدید!، تو اُس کے جواب کا اصول قدیم ہی ہے۔

علم کلام جدید کی اصل حقیقت

یہ تو مطالبہ علم کلام جدید کے محرک اور غرض پر کلام تھا۔ رہا وہ علم کلام جدید کہ جس کی تدوین کی واقعی حاجت ہے، اُس کی حقیقت کا اِظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

☆ ''البتہ اس میں شبہ نہیں کہ ا: بعضے شبہات جو اَلسنہ سے مندرس (اور ناپید) ہوچکے تھے، اُن کا اب تازہ تذکرہ ہوگیا ہے اور ۲: بعض کا کچھ عنوان جدید ہوگیا ہے اور ۳: بعض کے خود مبانی جن کو واقعی تحقیقات جدیدہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے باعتبار معنون کے بھی جدید پیدا ہوگئے ہیں۔ اس اعتبار سے اِن شبہات کے اِس مجموعہ کو جدید کہنا زیبا اور اُن کے دفع اور حل اور جواب کو اِس بناء پر بھی کہ جدید شبہات بالمعنی المذکور کے مقابلے میں ہیں۔ (یعنی شبہات، جدید اِس معنی میں ہیں کہ بعضے شبہات جن کا چرچا زبانوں پر نہیں رہ گیا تھا، اُن کا اب تازہ تذکرہ ہوگیا ہے اور بعض کا کچھ عنوان جدید ہوگیا ہے اور بعض کے خود مبنی منشا جدید پیدا ہوگئے ہیں۔ ف) و نیز اس وجہ سے بھی کہ بہ لحاظ، مذاق اہل زمانہ کے، کچھ طرزِ بیان میں جِدَّت مفید ثابت ہوئی ہے، کلام جدید کہنا درست و بجا ہے۔ اور اِس تاویل سے یہ مقولہ کہ علم کلام جدید کی تدوین ضروری ہے، محلِ انکار نہیں''۔

علم کلام جدید کی اِس حقیقت اور ضرورت کو سامنے رکھ کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے رسالہ ''الانتباهات المفيدة عن الاشتباهات الجديدة'' تصنیف فرمایا، جس میں اسلام کے اجزائے اعتقادیہ کے متعلق اُن تمام امور میں استدراکات اور اصلاحات فرمائیں، جن میں مسلمان مفکروں نے خود اِلتباس کا شکار ہوکر مغرب کے اختراع کردہ اصولوں کی پیروی کی تھی۔



دوسری قسط

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

حکیم فخر الاسلام ❖

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تجویز کے بہ موجب رسالہ ''الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ'' کی تدوینِ ''علم کلام جدید'' کا پہلا حصہ ہے۔ حضرتؒ کے منشور کی رو سے دوسرے حصہ کی نوعیت یہ ہوگی:

''موجودہ شبہات جمع کرکے ایک ایک کا جزئی طور پر جواب منضبط ہوجائے اور اِن جزئیات کی تقریر کے ضمن میں جو کلیات ضروریہ (ضروری اور اہم اصول وکلیات) حاصل ہوں، اُنھیں ضبط کرلیا جائے۔''

اور تیسرے حصہ کی آرزو اس طرح ظاہر فرمائی:

''اگر حق تعالیٰ کسی کو ہمّت دے اور وہ کتبِ ملحدین ومعترضین کو- جس میں اسلام پر سائنس یا قواعد مخترعہ تمدّن (تہذیب وتمدن کے موجودہ اصول وقواعد: ف) کے تعارض کے بنا پر شبہات کیے گئے ہیں- (مطالعہ کرنے کے بعد شبہات کو: ف) جمع کرکے مفصّل اَجوبہ بصورتِ کتاب قلم بند کردے، تو ایسی کتاب ''علم کلام جدید'' کے مفہوم کا اَحق (سب سے صحیح) مصداق ہوجاوے۔''

بعد ازاں ''اختتامی اِلتماس'' میں اِس اِسکیم کو پھر دہرایا ہے کہ: ''اگر خدائے تعالیٰ مجھ کو یا کسی اور کو توفیق بخشیں تو اسی (علم کلام جدید کے: ف) موضوع پر جس کی تفصیل تمہید (''وجہِ تالیفِ رسالہ'': ف) میں کی گئی ہے اور اِضافہ کی گنجائش ہے۔ گویا یہ حصہ اول ہے اور آئندہ اضافات دوسرے حصص''۔

۲- علم کلام جدید: نانوتوی- تھانوی اصولوں کی معنویت

جب علم کلام جدید کا اصل تعارف آپ کے سامنے آگیا، تو اب اِس امر پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے

❖ فاضل درسیات، بی یو ایم ایس علی گڑھ۔ ایم ڈی یونانی جامعہ ہمدرد، دہلی

کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں دفاعِ اسلام کی کاوشوں کا تجزیہ کرنے والوں نے اصل حقیقت کو چھپایا۔ یہ مغالطہ دیا کہ -بہ شمول الامام محمد قاسم نانوتویؒ وحکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ- اب تک علماء کا طبقہ مسائل وافکار کے مغالطوں سے بے خبر، جمود و بے حسی کا شکار اور ازالہ تشکیکات سے قاصر رہا۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو ضرورتیں اسلام کو انیسویں صدی میں پیش آئیں، اور جن جن مسائل سے نام نہاد مدافعینِ اسلام نے بحث کی، نہ صرف اُن تمام مسائل سے الامام محمد قاسم نانوتویؒ وحکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی گفتگو کی؛ بلکہ ہر دو متکلمینِ اسلام کا کام دو حیثیتوں سے فائق ہے۔ انہوں نے:

۱: سائنس، علومِ جدیدہ اور مغربی اصولوں سے ناشی مسائل کا اصولی اور فروعی حل پیش کیا۔

۲: خود ''مدافعینِ اسلام'' نے شریعت کے علمی وعملی اجزا میں عقلی بنیادوں پر جو اِلتباسات پیدا کیے تھے، اُنھیں دور فرمایا۔

اور راقم السطور کو اِس امر کے اِظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ جدید دور میں پروان چڑھنے والے جدید افکار کے دور رس مضر اثرات بطور خاص ہمارے مذکورۃ الصدر دو بزرگوں الامام محمد قاسم نانوتویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر منکشف ہوے اور انھوں نے اُصولی اور عقلی حیثیت سے اپنی لازوال تحقیقات کے ذریعہ اُن کا اِزالہ کیا۔ اِس حوالہ سے حضرت تھانویؒ نے تو اسلام کے دفاعی نظام کو سنبھال کر مسلمانوں کے عقائد واعمال کی حفاظت کی جب کہ حضرت نانوتویؒ نے غیروں کے مذہبی حملوں سے ایک طرف اسلام کے عقائد کی حفاظت کی، تو دوسری طرف فروع کے متعلق پیدا ہونے والے خلجانات کا عقلی اور اصولی بنیادوں پر جواب دیا۔ بایں لحاظ، آپ کا کام -گزشتہ دو صدیوں کے مفکروں کی تمام کاوشوں کے علی الرغم- دو حیثیت سے ممتاز ہے:

۱- ایک یہ کہ آپ کے مخاطب صرف مسلمان نہیں ہیں؛ بلکہ دنیا بھر میں علم اور عقل کی راہ سے دین حق کے باب میں مضطرب اور متشکِّک انسان ہیں۔

۲- دوسرے یہ کہ آپ نے یہ محسوس کیا کہ:

الف- قدیم سے چلے آرہے اصول جنھیں مسلَّم کہا جاتا ہے، اُن کا مسلم ہونا، واضح کردیا جائے۔

ب- تنقیح طلب مسائل کا عقل کے مسلم اُصولوں سے تجزیہ کرکے براہین قائم کیا جائے اور اُن کے ذریعہ مغرب کی جانب سے پیش آنے والے فکری مغالطوں کا ازالہ کیا جائے۔

ج- نیز جو نئے کلامی مسائل ہیں، نئے حالات اور علوم کے پیدا کردہ ہیں، جو نئے اصولوں اور نئے مسلمات پر مبنی ہیں، اُن کے مسلم ہونے، مطلق (universal) ہونے پر کلام کیا جائے، اُن کی حدود

واضح کی جائیں اور اُن کی اِطلاقی حیثیت پر روشنی ڈال کر اُن کا ظنی، یا فرضی ہونا مثلاً، دکھلا دیا جائے۔

اِن دونوں مقاصد کے لیے یعنی مسلمان مغرب زدہ طبقے کے لیے اور نیز اُن انسانوں کے لیے۔ جو راہِ حق کی یافت میں اصولی غلطیوں میں مبتلا ہیں- مذکورہ ہر دو اماموں نے اُسی فلسفہ سے کام لیا جو درسیات میں متداول رہا ہے۔ اِس کی چار وجہیں ہیں: ۱- اِسی سے تائیدِ حق وابستہ ہے۔ ۲- یہی وہ طریقہ کار ہے جو سلف سے بلا اِنقطاع محفوظ و منقول چلا آرہا ہے۔ ۳- تیسری وجہ- کہ جس سے مذکورہ دونوں وجھوں کی دلیل فراہم ہوتی ہے- یہ ہے کہ مسلمانوں نے فلسفہ کو بہ طور ایک ذریعہ اور آلہ کے اِس طرح استعمال کیا اور پھر ہر طرح کے مغالطوں سے اُن کو پاک کیا اور نکھارا، جس کے نتیجے میں عقل کے صحیح اصولوں کی تدوین ہوئی۔ ۴: چوتھی وجہ وہ ہے جس سے دورِ حاضر کے صحیح منہج کا تعین ہوتا ہے۔ اِس کو سمجھنے کے لیے فلسفہ کو چار مرحلوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے:

الف- یونان کا وہ عہد جس میں سوفسطائیوں (قدیم اِباحت پسندوں) نے ملمع کاری کر کے حقیقت کو چھپایا اور غیر حقیقی چیزوں کو پر فریب طریقہ سے حقیقت بنا کر پیش کیا۔ ایک طرف تو خود کو ظلمت زدہ عقائد و خیالات کے گھپ اندھیرے میں بھٹکائے رکھا، دوسری طرف اعمال و اخلاق میں نفسانیت، شہوت اور اباحیت کے اُس دلدل میں پھنسے رہے کہ کبھی اُس سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ اِسی وجہ سے متکلمین نے اُن کا لقب ''کلابیہ'' رکھا۔

ب- عقل کے اِن سوفسطائی مغالطوں کے ازالہ کے لیے سقراط نے نفس کی تہذیب اور روح کے ترقی کی غرض سے درست فلسفہ کے اصول وضع کیے جنہیں ''اصول اخلاق'' کہا جاتا ہے۔

ج- متکلمین کے سامنے یونانی اباحیت پسندوں کے مغالطے بھی تھے، افلاطون کے توسط سے سقراط کی حکمت اور اصولِ اخلاق بھی اور ارسطو کے توسط سے نوفلاطونیوں کا فلسفہ اور اِشراقی فلسفہ بھی۔ اِس تناظر میں، اُنہوں نے، حقائقِ اشیاء سے براہین اخذ کیے اور اسلامی ہدایات کو سامنے رکھ کر ایسے اصول مدون کیے جو قیامت تک کے واسطے دفاعِ اسلام کے لیے ڈھال بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اِن اصولوں کو کوئی توڑ نہیں سکا (کذا قال حکیم الامتؒ۔ (۲)

د- مغرب کی نشاۃ ثانیہ۔ (خیال رہے کہ نشاۃ ثانیہ کا اصل مقصد نشاۃ اولی کا اِحیاء ہے، یعنی یونانی سوفسطائیوں کے اِباحیت پسند اصولوں کا اِحیاء)۔ دور حاضر کے مغربی فلسفیوں، محققوں اور سائنس دانوں کا پیش رو اور راہ رو یہی طبقۂ سوفسطائیہ ہے۔ اپنے تمام افکار اور اخلاق کے تمام اصولوں میں اِس جدید مغرب

(۱) الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ، جلد ۵ ص ۵۲، جلد ۱۰ ص ۱۱۴، ۱۱۵، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۲۳ھ

نے اِسی طبقۂ سوفسطائیہ کو راہبر اور راہ نما بنایا ہے۔ ہاں دونوں میں موضوع کے لحاظ سے اِس قدر فرق ہے کہ سوفسطائیوں نے اپنی اغراض غلط طریقہ سے فلسفہ کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے حاصل کی تھیں۔ موجودہ مغربی مفکروں نے اپنے نفسانی مقاصد کے لیے سائنس کو استعمال کیا، لیکن فلسفہ کو چھوڑ کر نہیں؛ بلکہ سائنس کے تابع بنا کر۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ اہلِ سائنس کے اصول، قوانین، نظریات وافکار جن پر لیبل سائنس کا لگا ہوا ہے، وہ درحقیقت کسی خاص فلسفہ پر مبنی ہوتے ہیں، طریقۂ کار خواہ استقرائی اور سائنسی ہو، لیکن نتائج فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

ایک بات تو یہ ہوئی، اِس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اہلِ سائنس یا اُن کے متبعین جس فلسفہ کا انکار کرتے ہیں، وہ وہ فلسفہ ہے جس کو متکلمین، حکمائے اسلام اور محققین صوفیائے کرام نے اختیار کیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ متکلمین نے یونان سے حاصل ہونے والے فلسفے کو پہلے فاسد نظریات سے پاک کیا، پھر عقلی وشرعی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد اُس کا اِجرا کیا۔ اِس بنا پر مغربی سائنس سے مرعوب ومتاثر یا مخالف جو مسلمان فلسفہ کی مخالفت کرتے ہیں، درحقیقت مغالطہ میں ہیں اور وہ غیر شعوری طور پر صحیح عقلی اصولوں کا انکار کرتے ہیں، گویا حق کا انکار کرتے ہیں۔ اور جو مسلمان، سائنس زدہ مغربی افکار کی حمایت کرتے ہیں، وہ درحقیقت سوفسطائیوں (اِباحت پسندوں) کے خیالات کی تائید کرتے ہیں، گویا باطل کی تائید کرتے ہیں۔ اور جو تائید نہیں کرتے، وہ گویا صحیح اصولوں کی اتباع کے بجائے اپنی فہم کی اِطاعت کرتے ہیں اور ہر وقت معرضِ خطر میں ہیں۔ کیوں کہ مغربی سائنسی روِش کی ذات ہی میں باطل کی تائید شامل ہے اور وہ فلسفہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اَب بھی ہے، اُس کی ذات میں حق کی حمایت اور تائید داخل ہے۔ اور یہی وہ فلسفہ ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ ۱۹ویں صدی عیسوی میں وقت کے عظیم امام اور متکلم محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیقات سے آب وتاب حاصل ہوئی اور رونق ملی۔ لیکن اِس ناگزیر امر کے باوجود کہ دفاعِ اسلام کی غرض سے وقت کے اِس عظیم متکلم کی تصانیف سے اِستفادہ کیا جانا چاہیے، اپنی تحقیقات کے متعلق امام محمد قاسم نانوتویؒ خود یہ فرما گئے ہیں کہ: ''میرا سارا ذخیرہ بس یہی میرے ''پراگندہ خیالات'' ہیں جن کا حال یہ ہے کہ کسی کے دل کو اگر لگتے ہیں، تو ایسے لوگ بھی ہیں جو میری باتوں کو شاعرانہ خیالات تصور کرتے ہیں۔''(۱)

اس فقرے کی معنویت کا اِظہار کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''افسوس کہ دار العلومی سلسلے کے بعض لوگوں میں یہ بدگمانی پیدا ہوئی (کہ تحقیقاتِ قاسم سے بے دلی برتی) اور خدا نے ایک بڑے علم سے اُن کو محروم کیا۔''

(۱) نگارشات اکابر ص ۸۷ بہ حوالہ فیوض قاسمیہ ص ۲۴ حجۃ الاسلام اکیڈمی ۲۰۱۸ دیو بند

ایک سوال یہاں یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ''پراگندہ خیالات'' اور بعض لوگوں کے لحاظ سے ''شاعرانہ خیالات'' کہ درحقیقت دفاعِ اسلام اُنہی صحیح اصولوں سے وابستہ ہے، آخر کن علوم وفنون پر مبنی ہوا کرتے تھے؟ جواب ظاہر ہے کہ عقل کے صحیح اصولوں پر دسترس کے بغیر دفاعِ اسلام کے صحیح اصولوں تک رسائی اور علوم قاسم سے مناسبت ازبس دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا عقلی فنون کی طرف توجہ کا حال ذکر کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ:

''یہ معقول کی کتابیں میر زاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔''(۱)

جب یہ امام دوراں اِن کتابوں کو یہ اہمیت دیتا تھا، تو ''ماوشما'' کس شمار میں ہیں۔ پھر حضرتؒ کی کتابیں دیکھیے! کہ اِنہی اصولوں کے صحیح استعمال سے مالامال ہیں جو مباحث کی آفاقیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے سینکڑوں مسئلے ہیں جو امام قاسم نانوتویؒ کے پچاسوں اصولوں کے ساتھ اِنطباق اور تفریع کے محتاج ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر یہ اصول اور اِن کا استعمال مسائلِ حاضرہ کے ساتھ تشنۂ اِنطباق اور اپنی تفصیلات میں خواستگارِ تفہیم وتنقیح ہیں۔ وہ مسائل جنہیں اِن اصولوں کی روشنی میں دیکھا جانا ضروری ہے مثلاً یہ ہیں: الحاد (Atheism) کی مختلف شکلیں، سائنسی تعددِ الٰہ (Pantheism) سائنسی رجحان کے تحت خدا پرستی (Deism) لا ادریت (Skepticism) کی موجودہ سائنسی شکلیں، فطری مذہب (Natural religion)، فطری دینیات (Natural theology) کے فطری وجبلی اصولوں پر کلام، والٹیئر کے وجدانی اِنکشافات کے مغالطوں کی تنقیح، فطری دینیات کے اصول پر قائم شدہ آزاد اخلاقیات (Natural ethics) روسو کے جمہوری اصول اور بینتھم کے اِفادی اصول کا عقلی بنیادوں پر تجزیہ۔ غور سے دیکھیے، تو اِن مسائل سے تعرض کیے بغیر علوم نانوتویؒ کی فہم وتفہیم ہی نہیں؛ بلکہ شریعتِ غرا کا دفاع بھی دشوار ہے! وجہ اِس کی یہ ہے کہ اِن گمراہیوں کے عقلی اور نتیجہ خیز اصولی جوابات اُنہی اصطلاحوں، اصولوں اور اُن کی اُن تفصیلات میں موجود ہیں جنہیں حضرت نانوتویؒ نے عقلی رنگ میں پیش کیا ہے۔



(۱) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ: سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ

قسط (۳)

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

حکیم فخر الاسلام ❖

۳-حکمت اور علم کلام جدید

یونانی فلسفہ، متکلمین کا فلسفہ، مغربی فلسفہ اور الا مامین کے فلسفہ اور حکمت کی مذکورہ بالا اِجمالی گفتگو کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ فلسفہ کی ماہیت، کلی اقسام اور اُن اجزا کی بھی کسی قدر وضاحت کی جائے کہ علم کلام میں-خواہ جدید ہو یا قدیم-جن کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔

حکمت کی ماہیت: حکمت نام ہے حقائقِ موجودہ کے علم کا جو واقع کے مطابق ہو، اِس حیثیت سے کہ اُس سے نفس کو کوئی قابلِ ذکر کمال حاصل ہو۔

حکمت کے اِس مفہوم پر نظر کی جائے، تو تمام علوم-حتی کہ شریعت بھی-حکمت و فلسفہ کے ذیل میں آتے ہیں، کیوں کہ: جتنے علوم ہیں سب میں کسی نہ کسی حقیقت ہی کے احکام مذکور ہوتے ہیں۔" (۱)

جب یہ بات ہے، تو پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ شریعت کا مقصدِ اصلی ادائے حقوقِ خالق اور ادائے حقوقِ خلق کو ذریعہ رضائے حق بنانے کی تعلیم ہے۔ اور اِسی مقصد کی تحصیل میں فلسفہ کی بعض شاخیں شریعت میں بھی زیرِ بحث لائی جاتی ہیں۔ چناں چہ فلسفہ کی دو بڑی نوعوں میں سے ایک نوع "حکمتِ عملیہ" (یعنی: ۱-تہذیبِ اخلاق، ۲-تدبیر منزل، ۳-سیاستِ مدنیہ) جس کی مترادف ۱-عبادات، ۲-معاملات، ۳-معاشرات اور ۴-اخلاق ہیں۔ اِن سے تو شریعت نے اِس قدر کافی وافی بحث کی ہے کہ خود متبعینِ فلاسفہ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ شریعتِ اسلامی کے سامنے حکمتِ عملیہ کے متعلق کوئی ضرورت

❖ فاضل درسیات، بی یو ایم ایس علی گڑھ۔ ایم ڈی یونانی جامعہ ہمدرد، دہلی

(۱) حکیم الامت: الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ؛ "تمہید مع تقسیم حکمت"

لب کشائی کی باقی نہیں رہ گئی۔(۱)

رہی فلسفہ کی دوسری نوع ''حکمتِ نظریہ''! تو اُس کی ایک قسم ''علم الٰہی''۔(واجب الوجود کی ذات وصفات، وحی ونبوت، احوالِ معاد، ثواب وعذاب، جنت، دوزخ، صراط، میزان وغیرہ مباحث۔) سے متعلق ہے، جس کا نام ''علم عقائد'' ہے۔ ''حکمتِ نظری'' کی اِس صنف میں بھی اگر حکما اور جدید طبیعیین دلائل کا موازنہ کرتے، تو نتیجہ مذکورہ اعتراف کی شکل میں ہی ظاہر ہوتا؛ مگر افسوس ہے کہ درست اصولوں کے مقابلے میں اُنہوں نے اپنی رائے کو ترجیح دیا اور غلطی وغلبۂ خواہش اُن کے لیے راست نتیجہ میں سدِ راہ بن گئی۔

اب رہ گئیں ریاضیات وطبعیات، تو اِن کے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: ''ریاضی کو ادائے حقوقِ خالق یا خلق میں کوئی دخل نہیں، اس لیے شریعت نے بطور مقصودیت کے اِس سے کچھ بحث نہیں کی۔(اور جہاں تک طبعیات کا تعلق ہے، تو قرآن کریم میں: ف) اگر کہیں طبعیات وغیرہ کا کوئی مسئلہ آ گیا ہے، تو بطور آیت واستدلال علی بعض مسائل الالٰہی کے (ہے، مثلاً توحید کے ثابت کرنے کے لیے: ف) چنانچہ اس کے ساتھ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الاَلْبَابِ وغیرہ فرمانا، اِس کی دلیل ہے (کہ صانع کی معرفت کے لیے مصنوعات سے اِستدلال کیا گیا ہے: ف)۔(۲)

---

(۱) ''تہذیبِ اخلاق جیسی شریعت نے کی ہے، اُس کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے، حکماء کی کتابوں کو دیکھیے، پھر قرآن وحدیث کو دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ تہذیبِ اخلاق میں شریعت نے اِس قدر تدقیق کی ہے کہ حکماء اُس کی گرد کو بھی نہیں پہنچے۔ چنانچہ شریعت میں (خدا تعالیٰ کی) طلبِ رضاء کی بھی تعلیم ہے، جس کو فلاسفہ نے چھوا بھی نہیں۔ یہ رضا جڑ ہے سارے اخلاق کی۔ اور جس کا ایک بَیِّن اور نقد نفع تو یہ ہے کہ جو خدا سے ہر حال میں راضی ہوگا اُس کو کبھی پریشانی اور ناگواری نہ ہوگی، یہ کتنی راحت ہے۔ پھر شریعت نے اِس میں بھی ایک دقیقہ رکھا ہے، وہ یہ کہ رضا کے اختیار کرنے میں بھی دو طرح کی نیت ہوتی ہے۔ ۱- ایک تو یہ کہ رضاء کے اختیار کرنے سے راحت حاصل ہوتی ہے۔ حکمائے شریعت کہتے ہیں کہ یہ درجہ طلبِ رضاء کا، خفی شرک ہے۔ کیونکہ یہ شخص طالبِ راحت ہے، مقصود اِس کا راحت ہے۔ اور، ظاہر ہے کہ راحت خدا نہیں، بلکہ غیرِ خدا ہے، تو یہ شخص غیرِ خدا کا طالب ہوا۔ اور ۲- ایک اِس نیت سے رضاء اختیار کرتا ہے کہ بندہ کے ذمہ خدا کا یہ حق ہے کہ وہ جو حکم کردے اس پر بندہ راضی رہے۔ سو یہ درجہ مطلوب ہے اور یہ شخص موحِّد کامل ہے، مومن ہے، عارف ہے۔ اب بتلائیے! ہے کوئی حکیم ارسطو، سقراط، بقراط، اس دقیقہ کو سمجھنے والا؟ وہ تو اِس گرد کو بھی نہیں پہنچے۔'' (حکیم الامت: محاسنِ اسلام ص ۲۱۴، ۲۱۵)

(۲) کہ یہ طبعیاتی مسئلہ ذریعہ مقصود ہے، مقصود نہیں۔ پوری آیت اِس طرح ہے:

''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. آیت کے متعلق حکیم الامت مصنف علام فرماتے ہیں: ''ہر چند کہ اس آیت میں خاص فکر کا ذکر ہے جو کہ...بقیہ اگلے ص پر...

اِس طرح ’’حکمت کی کُل یہ چھ قسمیں ہوئیں۔۱: تہذیبِ اخلاق۔۲: تدبیرِ منزل۔۳: سیاستِ

....گذشتہ صفحہ کا بقیہ...آسمان وزمین کی پیدائش اور بناوٹ میں کیا جائے، کیونکہ یہ موقع اثباتِ توحید کا ہے اور مقصودِ مقام یہی ہے۔اور اثباتِ توحید میں تفکر فی السماء والارض کو خاص دخل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور کرو کہ یہ سب حادث ہیں اور حادِث کے وجود کے لئے مُوجِد کی ضرورت ہے۔اگر موجِد بھی حادث ہو تو اس کے لئے پھر موجد کی ضرورت ہوگی اور سلسلہ غیر متناہی چلے گا اور تسلسل محال ہے۔پس ضروری ہے کہ انتہاء واجب پر ہوگی اور اس کو ہم اللہ کہتے ہیں۔غرض فکر اس جگہ مقید ہے مگر مجموعی آیات سے جو اس باب میں وارد ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہر چیز میں فکر ہونا چاہئے، رسالت میں بھی، توحید میں بھی، اسی طرح اور کوئی عمل بھی فکر سے خالی نہ ہونا چاہئے۔میں اسی فکر کو بتلانا چاہتا ہوں جس کی ہر عمل میں ضرورت ہے اور فکر یہ ہے کہ جزا وسزا میں فکر کیا جائے، چنانچہ سورہ رحمن میں اول سے آخر تک اسی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور عقوبتیں بیان فرما کر بار بار سوال کیا ہے فَبِاَیِّ آلآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان جس کا حاصل یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اور عقوبتوں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہئے۔بہرحال سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔کہیں قیامت کے بارے میں ارشاد ہے اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰاتِ وَ الْاَرْضِ کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لئے مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰاتِ وَ الْاَرْضِ میں نظر چاہئے، نظر وفکر ایک ہی چیز ہے۔ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَ الآخِرَۃ کہ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ دنیا وآخرت میں فکر کرو۔تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا وآخرت میں تفکر کرو موازنہ کے لئے۔ان میں کون اختیار کرنے کے لئے ہے اور کون قابلِ ترک ہے۔اور دنیا میں جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل کے لئے ہو (یعنی ’’تحصیلِ دنیا کے لئے ہو، اس کو مقصود بالذات سمجھے‘‘) اور جو فکر ترکِ دنیا کے لئے ہو، وہ تو مطلوب ہے۔(اشرف التفاسیر جلد ۱ ص ۳۲۲ تا ۳۲۴)

اِسی طرح قرآنِ کریم کی ایک آیت اٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْن ہے۔پوری آیت اِس طرح ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (البقرۃ:۱۶۴) عام طور سے پیش کر دی جاتی ہے لیکن لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔اور بیان القرآن میں وتفسیری فائدہ کے تحت وضاحت اس طرح ہے: ف۱: ’’(ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود) ہیں ان لوگوں کے (استدلال کے) لیے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔ف۲: اسلام کے اصول یعنی توحید ورسالت مسائل عقلی ہیں، جیسا آیت میں یعقلون اس طرف اشارہ ہے اور فروع کا عقلی ہونا ضرور نہیں، البتہ کسی دلیل عقلی قطعی کے خلاف نہ ہونا ضرور ہے۔افسوس ہے آج کل نوخیز طبائع ان دونوں کو مخلوط کر کے عجب چکر میں پڑ جاتے ہیں جس کا اخیر انجام بد دینی ہے خوب سمجھ لو۔‘‘ (بیان القرآن ج ۱ ص ۱۰۳،۱۰۴ تاج پبلیشر دہلی ۱۹۹۴ء)

’’شارع علیہ السلام کا اصلی مقصود یہ ہے کہ لوگ کام کی بات میں لگ جاویں، اسی واسطے غیر مقصودی مضامین کی قرآن مجید اور احادیث شریفہ میں تفصیل نہیں فرمائی، اس میں شفقت ہے۔اب اِس تقریر سے بہت مسائل حل ہو گئے، مثلاً ستاروں کا وجود کہ کس آسمان پر ہیں، یہ کوئی مقاصد میں سے نہیں۔‘‘ (ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۶ الکلام الحسن ص ۳۵۸۔تالفات اشرفیہ ملتان)

مدنیہ۔۴:علمِ الٰہی۔۵:علمِ ریاضی۔۶:علمِ طبعی۔اور گواقسام الاقسام اور بھی بہت ہیں؛مگر اصولِ اقسام اِن ہی میں منحصر ہیں۔''(۱)

اِس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ علم کلام میں جو فلسفہ اور حکمت سے گفتگو کی جاتی ہے،تو اُس کا مقصد یہ ہے کہ عقل کے صحیح اصول اور اُن اصولوں کے صحیح استعمال کے ذریعہ سے افکارِ باطلہ کو پرکھا جاسکے اور ملت بیضاء کے پاکیزہ اصولوں کی ملتبس افکار سے حفاظت کی جاسکے۔اِسی غرض سے حکمائے اسلام اور متکلمین کو ہمیشہ اِس فن سے شغف رہا۔اور اِسی غرض سے عقلی علوم نہ صرف شاملِ درس رہے؛ بلکہ اُن کا پڑھنا پڑھانا موجبِ اجر سمجھا گیا۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''اِس اخیر زمانہ میں جن حضرات سے دین کو نفع ہوا۔وہ معقول ہی کی بدولت ہوا۔اُنہوں نے معقول کو منقول کرکے دکھلادیا تاکہ اغبیا کی سمجھ میں آجائے۔''

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے تھے کہ''میں جس طرح مطالعہ بخاری کو موجبِ اجر سمجھتا ہوں اُسی طرح میر زاہد اور امور عامہ کو۔''(۲)

الامام محمد قاسم النانوتویؒ تو کسی کو نصیحت کرتے ہوئے یوں تنبیہ کرگئے ہیں کہ:

''دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کیے بغیر دشوار ہے۔''(۳)

(جاری)



(۱) حکیم الامت: الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ؛ ''تمہید مع تقسیم حکمت''

(۲) ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵۔ملفوظات اطہر ص ۶۹

(۳) سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۹۸

قسط (۴)

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

حکیم فخر الاسلام ❖

۴-علم کلام جدید کے اصول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے علم کلام جدید کے حوالے سے مسائل پر گفتگو کے لیے ''الانتباہات المفیدۃ عن الاشتباہات الجدیدۃ'' میں سات اصول موضوعہ قائم فرمائے ہیں۔ اِن اصولوں کی اِفادیت ظاہر کرتے ہوئے مولانا عبدالباری ندویؒ فرماتے ہیں: ''اس کتاب میں اصول موضوعہ کا بیان اور شرح جس طرح فرمائی گئی ہے اگر اِن کو سمجھ کر پیش نظر رکھا جائے تو سابقہ شبہات ہی کا نہیں بلکہ آئندہ بھی قیامت تک جدید سے جدید تحقیقات سے پیدا ہونے والے شبہات کا بھی انشاءاللہ قلع قمع ہوتا رہے۔ مشہور فلسفی اسپنوزا کے علاوہ اور کسی نے اپنی کسی تصنیف میں یہ اقلیدسی یا ہندسی طرز اختیار نہیں کیا۔'' مولانا عبدالباری ندویؒ یہ بھی فرماتے ہیں: ''اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا سات اصول موضوعہ ایسے ہیں کہ اگر عقل ونقل یا دین ودانش کے مسائل ومباحث میں ان کو احتیاط وانصاف کے ساتھ دلیل راہ بنایا جائے تو قدیم وجدید سارے کلامی اختلافات میں عقل ونقل دونوں کو اپنی اپنی حدود میں رکھ کر حل کیا جاسکتا ہے۔'' اور ''جدید سے جدید علم کلام کی عمارت جدید سے جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں انہیں بنیادوں پر کھڑی کی جاسکتی ہے۔'' (۱) سات اصول یہ ہیں:

۱- ''کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا دلیل اُس کے باطل ہونے کی نہیں۔''

۲- ''جو امر عقلاً ممکن ہو اور دلیل نقلی صحیح اُس کے وقوع کو بتلاتی ہو، اُس کے وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر دلیل نقلی اُس کے عدم وقوع کو بتلاوے، تو عدم وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔''

❖ فاضل درسیات، بی یو ایم ایس علی گڑھ۔ ایم ڈی یونانی جامعہ ہمدرد، دہلی

(۱) مولانا عبدالباری ندویؒ: جامع المجدد دین

۳-''محال عقلی ہونا اور چیز ہے اور مستبعد ہونا اور چیز ہے۔ محال خلافِ عقل ہوتا ہے اور مستبعد خلافِ عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جُدا جُدا ہیں، دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہوسکتا، مستبعد واقع ہوسکتا ہے، محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور مستبعد کو غیر مُدرَک بالعقل۔ اِن دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔''

۴-''موجود ہونے کے لیے محسوس اور مشاہد ہونا ضروری نہیں ہے''۔

۵-''منقولاتِ محضہ (خاص منقول مسائل: ف) پر دلیل عقلی محض کا قائم کرنا ممکن نہیں، اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں۔''

۶-''نظیر اور دلیل جس کو آج کل ثبوت کہتے ہیں ایک نہیں۔ اور مدعی سے دلیل کا مطالبہ جائز ہے ؛مگر نظیر کا مطالبہ جائز نہیں۔''

۷-دلیل عقلی و نقلی کے تعارض میں چار صورتوں کا احتمال ہے: الف-ایک یہ کہ دونوں قطعی ہوں۔ اِس کا کہیں وجود نہیں، نہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ صادقین میں تعارض محال ہے۔ ب-دوسرے یہ کہ دونوں ظنّی ہوں۔ وہاں جمع کرنے کے لیے گو ہر دو میں مجازی معنی اختیار کرنے کی گنجائش ہے؛ مگر لسان کے اِس قاعدہ سے- کہ الفاظ میں جہاں تک ممکن ہو، ظاہری معنی مراد لیے جاتے ہیں-نقل کو ظاہر پر رکھیں گے اور دلیل عقلی کی دلالت کو حجت نہ سمجھیں گے۔ ج-تیسرے یہ کہ دلیل نقلی قطعی ہو اور عقلی ظنی ہو۔ یہاں یقیناً نقلی کو مقدم رکھیں گے۔ د-چوتھے یہ کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی ہو ثبوتاً یا دلالۃً۔ یہاں عقلی کو مقدم رکھیں گے، نقلی میں تاویل کریں گے۔ پس صرف یہ ایک موقع ہے درایت کی تقدیم کا روایت پر۔ لہٰذا ہر جگہ عقل کو نقل پر مقدم رکھنے کا دعویٰ کرنا، یا عملاً مقدم رکھنا درست نہیں۔

[اصول موضوعہ نمبر۱]

اِس اصول کا تعارف کراتے ہوئے حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ لکھتے ہیں: ''ہر علم وفن میں دن رات اِس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے یگانۂ روزگار ماہرین کی مسلم سے مسلم تحقیقات رد ہوتی رہتی اور ان میں غلطیاں نکلتی رہتی ہیں۔ اور کسی علم وفن کا کوئی بھی مسئلہ ونظریہ ایسا نہیں ہوسکتا جس کی ابدی صداقت کا کوئی ہوشمند دعویٰ کرسکے۔ اس کے باوجود آدمی کا یہ جہل مرکب کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو بات اپنی سمجھ میں نہ آئے یا کسی رائج ومقبول عام خیال کے خلاف معلوم ہوتی ہو، اس کو غلط اور باطل سمجھنے لگتا ہے، حالاں کہ جب طبعی وتجربی علوم تک میں ہماری فہم وتحقیق ابدی صداقت کا معیار نہیں، تو مابعد الطبعی یا دینی وغیبی علوم میں ہماری سمجھ ابدی حق وباطل کی کسوٹی کیسے بن سکتی ہے؟ اس لیے سب سے پہلا اصول

موضوعہ یہی قرار دیا گیا کہ:

''کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا دلیل اُس کے باطل ہونے کی نہیں۔''

اِس اصول کی مدد سے محسوسات، روزمرہ کے تجربات ومشاہدات کی دو مثالوں کے ذریعہ قیامت میں پل صراط پر چلنا، مشرک کا نہ بخشا جانا جیسے اسلامی عقیدوں کو واضح کیا گیا ہے۔(۱)

[اصول موضوعہ نمبر۲]

اصول موضوعہ۲ کے ضمن میں واجب، ممتنع اور ممکن کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ دوسرا اصول اہم اس وجہ سے بھی ہے کہ عقل کے نزدیک جو چیزیں امور ممکنہ میں داخل ہیں وہ جدید فلسفہ اور سائنس کی راہ سے واقعاتی امور(Matter of facts) کے مغالطہ میں محال کے دائرہ میں دکھلائی جاتی ہیں۔ اِس اصول کی رو سے حضرتؒ نے آسمانوں کا اس طور پر جیسا جمہور اہل اسلام کا اعتقاد ہے-عقل کی رو سے-ممکن ہونا واضح کیا ہے اور نقل کے ذریعہ ثبوت کو اُس پر حجت قرار دیا ہے۔(۲)

وہ اصول یہ ہے: ''جو امر عقلاً ممکن ہو اور دلیل نقلی صحیح اُس کے وقوع کو بتلاتی ہو، اُس کے وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔ اِسی طرح اگر دلیل نقلی اُس کے عدم وقوع کو بتلاوے، تو عدم وقوع کا قائل ہونا ضروری ہے۔''

[اصول موضوعہ نمبر۳]

اصول موضوعہ۳ میں محال اور مستبعد کے درمیان فرق واضح کر کے دونوں کے احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ: مستبعد کی تکذیب-اگر کوئی دلیل نہ ہو تو محض استبعاد اور خلاف عادت ہونے کی بنا پر-جائز نہیں۔ یہ بات مثالوں سے واضح کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ قیامت میں ہاتھ پیروں کے بولنے کا واقعہ چوں کہ محض مستبعد ہے، محال نہیں، لہٰذا اِنکار جائز نہیں۔ دوسری طرف یقینی خبر (نص قطعی) کے ذریعہ اطلاع دی گئی ہے، اس لیے-متذکرہ بالا اصولِ موضوعہ نمبر۲ کی رو سے-اِس کا تسلیم کرنا اور قائل ہونا ضروری ہے۔ تیسرا اصولِ موضوعہ یہ ہے:

''محال عقلی ہونا اور چیز ہے اور مستبعد ہونا اور چیز ہے۔ محال خلافِ عقل ہوتا ہے اور مستبعد خلافِ عادت۔ عقل اور عادت کے احکام جُدا جُدا ہیں، دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ محال کبھی واقع نہیں ہوسکتا، مستبعد واقع

---

(۱) مولانا عبدالباری ندویؒ: جامع المجددین ملخصاً

(۲) مولانا عبدالباری ندویؒ: جامع المجددین ملخصاً۔

ہوسکتا ہے۔ محال کو خلافِ عقل کہیں گے اور مستبعد کو غیر مُدرَک بالعقل۔ اِن دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے‘‘(۱)

[اصول موضوعہ نمبر۴]

کسی چیز کے موجود ہونے پر استدلال تین طریقہ سے ہوتا ہے۔۱: مشاہدہ۔۲: مخبر صادق کی خبر۔ ۳: استدلال عقلی۔ یہ تینوں طریقے گویا تین دلیلیں ہیں۔ اس میں محسوس دلیل صرف ایک ہے، باقی دو دلیلیں غیر محسوس ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ غیر محسوس شی کا انکار کرنا جائز نہیں۔ اِسی اصول کو شرعیات میں جاری کیجیے! کہ مثلاً نصوص نے خبر دی ہے کہ ہم سے بلندی پر ’’آسمان‘‘ نام کے سات عظیم اجسام ہیں۔ تو اگر اس نظر آنے والے نیل گوں خیمہ کے سبب وہ ہم کو نظر نہ آتے ہوں، تو محض نظر نہ آنے کی وجہ سے اِنکار درست نہیں۔ اصول موضوعہ نمبر۴ میں یہی بتایا گیا ہے کہ:

---

(۱) ’’خلاف عقل وہ ہے جو عقلا ناممکن ہو۔ یعنی عقل اُس کے استحالہ (محال ہونے۔ف) پر دلیل قائم کر سکے۔ اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو۔ تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب جو لوگ معادیات کو اور پل صراط، وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں، وہ مہربانی کر کے اُن کے استحالہ پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ اُن کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیوں کر لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ پر نہیں قائم کر سکتے۔ بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں کر ہو جائے گا؟‘‘

قرآن مجید کی سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں مذکور ہے کہ حضرت حوّاؑ کو حضرت آدمؑ سے پیدا کیا گیا اور صحیح بخاری و مسلم میں مختلف طریقوں سے یہ روایت مروی ہے کہ حضرت حوّاؑ کو حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ جمہور امت کا یہی موقف ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سورۂ نساء کے تفسیری فائدہ کے تحت لکھتے ہیں:

’’اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے، ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا کیوں کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرے جاندار کا جاندار سے بلا طریقِ توالد متعارف پیدا ہونا کیوں کہ حضرت حوا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں، جیسا حدیث شیخین وغیرہما میں ہے۔ اِنَّھُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضَلْعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَیْءٍ مِنْ ضَلْعٍ اَعْلَاہُ (عورتیں ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں)۔ اور تیسرے جاندار کا جاندار سے بطریقِ توالدِ متعارف پیدا ہونا جیسا اور آدمی آدم وحوا سے اِس وقت تک پیدا ہوتے آرہے ہیں۔ اور فی نفسہ عجیب ہونے میں اور قدرت کے سامنے عجیب نہ ہونے میں تینوں صورتیں برابر ہیں۔ پس بعد ثبوت بالدلیل کے کسی صورت کا محض بنا بر توہم پرستی انکار کرنا، جیسا کہ بعضے صورتِ ثانیہ (حضرت حوا کا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونے۔ف) کے منکر ہیں، نہایت ہی ظلم ہے۔......‘‘ (بیان القرآن: جلد۱، پارہ۴، ص۳۱۶)

لیکن اِس کے برخلاف بعض مفسروں نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہ لکھا کہ: ’’یہ روایت کہ حضرت حوا کی پیدائش حضرت آدم کی پسلی سے ہوئی ہے، توریت کی ہے.... بعض حدیثی روایتیں جو اس مضمون کی مروی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایسی نہیں ہے جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو، اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں جو کچھ کہا ہے اُس کی تعبیر اور طریقوں سے بھی ہوسکتی ہے‘‘۔ (تفسیر ماجدی جلد۱ص۱۰۶ مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ ۲۰۰۸ء)

بغیر کسی عقلی وشرعی مجبوری کے ظاہر معنی سے عدول کر کے محض اپنی رائے سے ’’اور طریقوں سے‘‘ تفسیر کرنا، گویا صحیح عقلی اصول چھوڑ کر اُن لوگوں کے خیالات کی ہم نوائی کرنا ہے جو حضرت حوا کا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کو خلاف فطرت ہونے کی بنا پر محال گردانتے ہیں۔

''موجود ہونے کے لیے محسوس اور مشاہد ہونا لازم نہیں۔''(۱)

[اصول موضوعہ نمبر۵]

دینی عقائد، رسول کی تعلیمات اور آخرت سے متعلق معاملات سب امور، منقولات محضہ ہیں۔ خبر و نقل کے ذریعہ حاصل ہونے والی تمام چیزوں کے متعلق از روئے عقل ممکن ہونے، نہ ہونے، از روئے روایت، خبر کے سچی ہونے، نہ ہونے کا تو سوال کیا جا سکتا ہے؛ لیکن ثبوت کے لیے عقلی دلیل کا مطالبہ جائز نہیں۔ اصول موضوعہ ۵ میں اِسی کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر اِس اصول کا اِنطباق کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قیامت کا آنا مردوں کا زندہ ہونا چونکہ منقول واقعات ہیں، اس لیے اِن کے متعلق بس اتنا کافی ہے کہ یہ واقعات محال نہیں۔ ایسی صورت میں قاعدہ یہ ہے کہ جس بات کا محال ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو، وہ ممکن ہوتا ہے۔ دوسری طرف اصول نمبر۲ کے تحت بتایا جا چکا ہے کہ جس ممکن واقعہ کی خبر ایسا شخص دے جس کا سچا ہونا دلائل سے ثابت ہو، اُس کا ماننا ضروری ہے:

''منقولات محضہ پر دلیل عقلی محض کا قائم کرنا ممکن نہیں، اس لیے ایسی دلیل کا مطالبہ بھی جائز نہیں۔''(۱)



---

(۱)''صرف محسوس نہ ہونے کے سبب کسی امر کا انکار صریحاً عقل کی بدہضمی ہے۔''(اشرف الجواب ص۴۸۴)''شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہم کو تحقیقاتِ جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہوتا ہے کہ حکماء (اہل سائنس) کا تو مشاہدہ ہے اور اسی بنا پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے؟..... میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت کو ہی نہیں جانتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہوگئی، پھر شمس و کواکب ہوئے، نباتات ہوگئی اور نباتات سے حیوانات'' کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے، زمین کو حرکت ہے۔؟''(اشرف الجواب ۵۳۶)

(۲) اس جگہ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ''اصول میں دلائل عقلیہ کی ضرورت ہے۔ خدا کا خدا اور رسول کا رسول ہونا ہم دلائل عقلیہ سے ثابت کردیں گے لیکن فروع (منقولاتِ محضہ) میں تفویض محض ہوگی۔''(ملفوظات جلد۱۱، حسن العزیز ج۲.جدید ملفوظات: ص ۱۱۸ تا ۱۱۹)''فروع کے لیے بھی اگرچہ نفس الامر میں دلائل عقلیہ اور اُس میں اسرار ہیں؛ لیکن ہم کو اُن اسرار پر مطلع نہیں کیا گیا۔ اِس سے معلوم ہوگیا کہ کسی شخص کو شرعیات کی لِم دریافت کرنے کا منصب نہیں۔ اور اگر کوئی پوچھے بھی تو علماء کو جواب میں یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ہم واضعِ احکام نہیں ہیں جو علت جاننا ضروری ہو؛ بلکہ عالم قانون ہیں جس میں علت جاننا لازم نہیں۔ واضعِ قانون حق تعالی ہیں۔ تو علماء سے قوانین کی علت اور لِم دریافت کرنا بھی سخت غلطی ہے۔ (پھر) ہر جگہ علت بیان کرنا بھی ممکن نہیں کسی جگہ تو ضرور خاموش ہونا پڑے گا۔ مثلاً اگر کوئی پوچھنے لگے کہ مغرب کے وقت تین رکعت کیوں مقرر ہوئی؟ اور حج، ذی الحجہ میں کیوں مقرر ہوا؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟ یا کوئی پوچھنے لگ کہ نماز پانچ ہی کیوں مقرر ہوئی؟ تو ہمارے پاس کیا معقول جواب ہے؟ تو جب کہ کسی نہ کسی جگہ پہنچ کر اِس قاعدے سے کام لینا پڑے گا تو پہلے ہی سے اِس سے کیوں نہ منتفع ہوں۔''